دیا۔ ہیگل اور مارکس نے الوہیت حقائق واقعہ (Deism of Existing Facts)
پر ایمان لاتے ہوئے تاریخ کو یہی درجہ عطا کیا۔ ہوتے ہوتے نوبت بہ اینجا رسید کہ Facts
of Language کو الوہیت کا درجہ حاصل ہو گیا۔

تاہم ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسانی عقل و فہم کا معیار صدیوں کے اُلٹ پھیر کے باوجود نہ بدل سکا
اور ہم اسے کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی ڈگر پر چلتا ہوا دیکھتے ہیں
نے ایک جگہ لکھا ہے

"The idea of a law which determines the direction and the character of evolution is a typical ninteenth century mistake arising out of the general tendency to ascribe to the natural law the functions traditionally ascribed to God."

اسی طرح مارکس ازم نے جو Historical Prophecies کی ہیں وہ بھی
(انسان ہی کے لکھے ہوئے) Old testament کی پیشین گوئیوں سے اپنی عمومی
نوعیت کے اعتبار سے قطعاً منفرد نہیں۔ بیکن اور دیکارت نے جس انقلاب فکر کی ابتدا کی اس کی
بنیاد اس اصول پر رکھی گئی کہ "سچائی عالم آشکار ہے (The Truth is manifest)
اس فکر کے پیشِ نظر انسان کو تحصیلِ علم اور تزیہہ حقائق کے لئے حواس اور عقل سے ماورا کسی منبعِ
علم سے بے نیاز کرنے کا جذبہ تھا اور اس طرح دورِ جدید کے فلاسفہ نے اس رجائیت پسندی
کی بنیاد رکھی جو ماورائے عقل اور مابعد الطبیعات حقائق کے کھوج سے فرار پر مبنی تھی۔ اپنی اس
"دریافت" کو ان حکمار نے اس فارمولے میں سمونے کی کوشش کی کہ

"Man can know, Thus he can be free"

اور اس طرح یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ فقط یہی فلسفۂ رجائیت، آزادروی کے رجحانات
پیدا کر سکتا ہے۔ ایک بار پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پرانی شراب نئی بوتلوں میں بند کر کے پیش کی جا رہی
ہے جب [illegible] یہ کہتا ہے "All Knowledge is re-cognition"

© rasailojaraid.co
© rasailojaraid.co

تو وہ بھی اسی بات کا اظہار کر رہا ہے

(جب افلاطون یہ کہتا ہے کہ ——— ہماری روح فطرت سے کامل ہم آہنگی رکھتی ہے اور تمام علوم سے واقفیت ! پیدائش کے عمل کے دوران ہم یہ سبھی کچھ فراموش کر دیتے ہیں، لیکن بالآخر ہم اپنی یادداشت واپس لانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ——— تو کیا افلاطون علم آدم الاسماء کلّھا اور عہدِ الست کی تفسیر بیان نہیں کر رہا ؟)

بہر حال ہم بات کر رہے تھے رجائیت پسندی اور اس کے پیدا کردہ آزادروی کے رجحانات کی۔ دورِ جدید کے تمام افکار کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ :

——— انسانی علم انفرادی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اور تمام انسانی کمزوریوں سے پوری طرح مرصّع

——— اگر ہم اس کمزوری سے بچنے کے لئے Objective truth کے نظریہ پر ایمان لاتے ہوئے بین الانسانی علم تشکیل دینا چاہیں تو ہمیں ایک کبھی نہ ختم ہونے والے ——— Rational self criticism کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔

——— بنی نوعِ انسان بحیثیت مجموعی اپنے ہی جیسے انسانوں کے پیش کردہ علم کی "حاکمیت" قبول کرنے پر تیار نہیں ہو سکتی۔

——— انسان یا تو اپنے ہی گھڑے ہوئے بت ——— کوئی نظریہ ——— کی پرستش کرتے ہوئے اپنی آزادروی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا یا بہتر نظریہ کی کھوج میں ایک لامحدود تگ و دو کا شکار ہو جائے گا۔

——— یہ تمام نظریات کسی ایسی Authority کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں جو - Un challangable ہو

درج بالا تمام حقائق کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج کا انسان عقلیت کے فریب میں آ کر ایک ایسے دوامی کرب کا شکار ہو گیا ہے جس سے نجات اسے ممکن نظر نہیں آتی۔ وہ جو - Existen tial Faith کی بات کرتے ہیں خود ہی Bad Faith کا شکار ہیں۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی فلسفی اپنے "قال" کو "حال" کا درجہ نہ دے سکا۔ اس کا علم نہ تو اسے عقلی طور پر مطمئن کر سکا نہ قلبی طور پر۔ اگرچہ بعض حکماء جو راہِ راست کی جانب دو چار قدم اٹھا سکے گاہے گاہے تائید کرتے رہے:

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

" Failure to act according to moral law is nothing but failure to be free." (Kant)

تاہم انسان اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے جال میں خود ہی بری طرح گرفتار ہوتا چلا گیا۔ اور اس کی محدود عقل نئے سے نیا اور حقیر سے حقیر بت تراشتی رہ گئی۔

علامہ اقبال نے جب الٰہیات کی تشکیل جدید کے سلسلہ میں اپنی Epistemology ترتیب دی تو محولہ بالا فلاسفہ ہی کے پیرایہ میں کائناتی وحدت کو حقیقت ثابتہ کا درجہ دیا اور وجدان کو اس حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ثابت کیا گیا۔

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالم پندار کرد

اقبال کے نزدیک زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے اور اس کی ماہیت میں خواہشات اور مطمح ہائے نظر کی مسلسل تخلیق مضمر ہے۔ نئے نئے معیارات کی تشکیل، ایک مستقل کشاکش کو جنم دیتی ہے۔

سازد از خود پیکر اغیار را
تا فزاید لذت پیکار را

خودی کو دو گونہ لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنے ماحول سے برسر پیکار رہتی ہے اور تسخیر عالم کی جدوجہد میں مصروف۔ دوسری جانب اپنے آپ کو لافانی بنائے رکھنے کے لئے وہ اپنے لئے نت نئے معیار اور مطلوب و مقصود تشکیل دیتی رہتی ہے۔ گویا اپنے لئے لافانی ہونے کا انتخاب کرتے ہوئے وہ اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور اس لمحہ خودی اپنی آزادی اور اپنی لافانیت کا اثبات کرتے ہوئے پکار اٹھتی ہے:

اے سوار اشہب دوراں بیا
اے فروغ دیدۂ امکاں بیا

اس طرح اقبال جو نظریہ پیش کرتا ہے، وہ آزادی و خود مختاری اور حاکمیت و الوہیت کے [illegible] کا ایک حسین [illegible] ہے۔ جب ہم اس نظریہ کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو تقدیر [illegible] کہ یہی وہ نظریہ ہے جو مجبوری و مختاری کے تمام فلسفیانہ مسائل کا حل ہے۔

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست !!
زانکہ تقدیرات حق لا انتہاست

© rasailojaraid.com

شبنمی افتادگی تقدیرِ تُست ——! قلزمی پائندگی تقدیرِ تُست

دنیا میں فقط ایک نظریۂ علم ایسا ہے جو حقیقی معنوں میں رجائیت پسند ہے اور آزادروی کے رجحانات کو جنم دینے والا ہے اور وہ ہے نظریۂ علم بالوحی!

تقدیر کے پابند نباتات وجمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

احکام الٰہی کی پابندی —— وحی کی متابعت —— ایک ایسی ذات کی حاکمیت کا اقرار ہے جو سب سے بزرگ وبالا ہے۔ ایک ایسے علم کی رہنمائی قبول کرنا ہے جس میں کسی من کی موج کا کوئی شائبہ نہیں۔ ایک ایسے نظریہ کی قبولیت ہے جس کا کوئی رد نہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسی آزادروی کے لئے خود کو تیار کرنا ہے کہ

دل بکسے نہ باختہ با دو جہاں نہ ساختہ ——!

یہ تو ایک ایسی ستیزہ کاری ہے کہ اگر اس میں خونِ جگر شامل ہو جائے اور آتشِ شوق کی آنچ میسّر ہو تو اس کی پہنچ قلب کے منور گوشوں سے لے کر آفاق کی عمیق ترین وسعتوں تک ہے۔

علم بالوحی کا جو خاصّہ قرآن پاک میں بیان کیا گیا ہے وہ یقیناً کسی اور منبع علم کو حاصل نہیں یعنی —— "علم الانسان مالم یعلم" —— وہ تمام امور جو مابعد الطبیعات سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کے بارے میں منطق اور کلام کے تمام اصول و قوانین ناکافی ثابت ہوئے ہیں، ان تمام امور کے بارے میں ٹھیک ٹھیک رہنمائی ہمیں ملتی ہے تو قرآن پاک سے! اس لئے ہماری epistemology کا اصل الاصول یہ قرار پاتا ہے کہ ایمان بالغیب کی حاکمیت (Authority) کو تسلیم کرتے ہوئے علم بالوحی کو حقیقتِ واقعہ کے طور پر قبول کیا جائے۔

جب ہم ایک ایسے نظریۂ علم کو قبول کر لیتے ہیں جس کی حدود ہمارے حواس کی حدود سے وسیع تر ہیں اور ہماری عقل کی تنگنائیوں سے کہیں وسیع ہیں تو ہمیں اس کرب سے دوچار نہیں ہونا پڑتا جو لاادریت کی صورتحال کا خاصہ ہے۔ ہمیں اس کرب سے بھی نجات مل جاتی ہے جو اپنے ہی کسی ہمسر یا اپنی ہی کسی تخلیق کی غلامی کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب ہم کو الوہیت اور حاکمیت کا ایک ایسا معیار مل جاتا ہے جو ہر تنقید سے بالا ہے تو ہماری روح پکار اٹھتی ہے

"واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا"

اور وہ ذات جو تمام غایتوں کی غایتِ اولیٰ ہے، تمام علوم کا منبع ہے، تمام حکمتوں کا خزینہ ہے

(باقی صفحہ ۴۱ پر)

© rasailojaraid.co
© rasailojaraid.co

# انسان: صلاح و فسادِ عالم کا مرکزی کردار

از قلم: مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

زیرِ نظر مضمون دراصل مولانا کی ایک زیرِ طبع کتاب "سیرۃ الخلیل" کے ایک باب کا ایک جزو ہے (یعنی باب اوّل کا تیسرا عنوان) — چونکہ یہ مضمون دین کے فلسفہ و حکمت سے متعلق ہے اس لئے اسے شاملِ شمارہ کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

حضرت ابراہیمؑ کی سیرت کے مختلف گوشوں اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر خامہ فرسائی کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس قدرتی سوال کا تسلی بخش جواب فراہم کیا جائے کہ ........ انسانی بدحالی کی انتہا سہی ........ سرے سے نبوّت ........ یعنی اصلاح الناس کی خدائی تدبیر ........ کی حاجت ہی کیا تھی؟ جس کی تاثیر کے لئے تخلیق و تکوین کے عام قاعدوں کو توڑ پھوڑ کر نئی نئی کرشمہ سازیاں دکھائی جاتی ہیں[1] ۔ اور ماننے نہ ماننے والوں کی نہ ختم ہونے والی ستیزہ کاریاں روا رکھی جاتی ہیں۔ ——

یہ مرکزی سوال تین باتوں کی تحقیق نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا اصل جواب بھی انہی تین باتوں کی مکمل تشریح و توضیح ہی ہے۔

پہلی بات یہ کہ کائنات میں انسان کی حیثیت اور مقام کیا ہے؟ ——

—— دوسری یہ کہ راہِ صواب کی یافتگی کے لئے اس کی اپنی عقل و خرد کافی نہیں تھی؟ اور

---

[1] انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی صداقت ظاہر کرنے کے لئے ان کو معجزات و خوارق سے نوازا جاتا ہے۔ جو تکوین کے عام قاعدوں کے شکست و ریخت ہی سے

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

—— تیسری بات یہ کہ وہ بہت اہم اور اس کی
عقل ناکافی سہی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ شرعی رہنمائی کے بغیر تباہ و برباد ہو جاتا، آخر خدائے کبیر و متعال کی عزت و عظمت اور کبریا و جبروت کا کون سا گوشہ اس سے متاثر ہوتا جو اس کی اصلاح اور ہلاکت و ضیاع سے بچاؤ اس قدر ضروری ٹھہرا ——— چنانچہ باب اول کے اختتام تک انہی تین سوالوں کا خاطر خواہ جواب دینے کی کوشش کی جائے گی ——

انسان جو بظاہر کئی فٹ کے احاطے میں سمویا ہوا ایک معمولی سا کالبد خاکی نظر آتا ہے اور اپنی بے شمار مادی ضروریات کے ہاتھوں میں ایک بے بس کھلونا دکھائی دیتا ہے، فی الواقع ایسی عظمت و رفعت کا حامل ہے جو کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو شعوری یا غیر شعوری طور پر بلا جھجک تسلیم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی بقاء حیات میں عرش تا فرش پھیلی ہوئی مخلوقات میں سے ایک ایک چیز کا محتاج ہے کہ یہ سب اس کی نشوونما میں بلا واسطہ یا بالواسطہ اثر رکھتی ہیں۔ لیکن در حقیقت یہ ساری چیزیں اسی کا فیض وجود ہیں کہ خلق و ایجاد کی غایت اصلی اسی کی ابتلاء و آزمائش ہے اور باقی سارا عالم رنگ و بو اس کی تکمیل کا ساز و سامان ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ افضل الموجودات اور اشرف المخلوقات قرار پایا ہے ——

بادی النظر میں اس کی یہ شرافت قدرت کی ایک ایسی حاکمانہ تخصیص معلوم ہوتی ہے جس میں کسی حکیمانہ وجہ استحقاق کا کوئی عمل دخل نہ ہو لیکن ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ فقط فضل و شرف انسانی ہی پر کیا منحصر، کسی بھی تکوینی حادثے یا تشریعی حکم کو خدا تعالیٰ کی مشیت قاہرہ ہی کا نتیجہ سمجھنا حد درجہ ظاہر بینی اور کسلمندی یا اس قلندرانہ اغماض کی روش تو ہو سکتی ہے جو ناپختہ حال صوفیاء کا وطیرہ ہے لیکن سلیم العقل خدا شناس مرد مومن کا طریقہ ہرگز نہیں ——

صحیفۂ عالم کا وسیع مطالعہ کرنے سے یہ بخوبی روشن ہو چکی ہے کہ خدائے مختار نے دنیا کی کوئی چیز بے کار نہیں بنائی ۔ ع

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں     کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

جوں جوں تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے توں توں ہر چھوٹی بڑی چیز کے منافع ہم پر ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ افادیت اور حکمت و مصلحت پر استواری کا یہ قانون کیا تکوین

© rasailojaraid.com

اور کیا تشریع دونوں میں یکساں طور پر نافذ اور جاری ہے ــــ

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ (سورۃ انبیاء ۔ آیت ۱۶)

ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس طور پر نہیں بنایا کہ عبث کام کرنے والے ہوں ۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (سورۃ حجر آیت ۸۵)

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان چیز کو بغیر مصلحت کے پیدا نہیں کیا ۔

اس نوع کی دوسری آیات تکوینیات کی ایک ایک جزئی کی حکمت آمیزی کی شہادت دیتی ہیں، اسی طرح سے تشریعی احکام بھی محض قدرت کی عظمت اور جبروت کا اظہار نہیں بلکہ لاتعداد دینی اور دنیاوی منفعتوں کا ذریعہ ہوتے ہیں ـــ امام ابن تیمیہؒ نے "منہاج السنۃ" میں اسی کو جمہور اہل تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور کلام کا اجماعی مسلک قرار دیا ہے ۔ اسی طرح علماء ہند کے سب سے بڑے رازداں اور محرم اسرارِ شریعت حضرت شاہ ولی اللہؒ، اپنی مشہور زمانہ تالیف "حجۃ اللہ البالغہ" کے آغاز میں ہی تحریر فرماتے ہیں :ــ

قد يظن ان الاحكام الشرعية غير متضمنة لشئ من المصالح وانه ليس بين الاعمال وبين ما جعل الله جزاء لها مناسبة وان مثل التكليف بالشرائع كمثل سيد اراد ان يختبر طاعة عبده فأمره برفع حجر او لمس شجرة مما لا فائدة فيه غير الاختبار فلما اطاع او عصى جوزي بعمله وهذا ظن فاسد تكذبه

کبھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شریعت کے احکام عقلی مصالح پر مشتمل نہیں اور نہ اعمال اور ان کی جزا و سزا میں کوئی مناسبت ملحوظ ہے اور انسان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے احکام شرعیہ کا مکلف بنانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی آقا اپنے غلام کی فرمانبرداری کا امتحان لینا چاہے اور اس کو کسی پتھر کے اٹھانے یا کسی درخت کے چھونے کا یا کسی اور کام کا حکم کرے جس میں اس کی آزمائش کے سوا کوئی فائدہ نہ ہو اب اگر اس نے اطاعت کی یا نافرمانی کی تو

© rasailojaraid.com

السُنّة واجماع القرون — اسی کے مطابق اس کو بدلہ دیا جائے گا۔

المشهود لها بالخير: — یہ گمان کرنا بالکل فاسد ہے جس کی

تکذیب سنّتِ رسول ؐ اور قرونِ اولیٰ کے اجماع نے کی ہے جس کی اچھائی کی شہادہ دی جا چکی ہے۔

تاہم یہ ضروری نہیں کہ کسی بھی تکوینی یا تشریعی امر کے جملہ یا بعض اسرار و حِکَم تک ہر ہر فردِ انسانی یا کم سے کم کسی بھی فرد کی رسائی بالضرور ہو۔ تکوینیات کی مصلحتوں کا تو ذکر ہی کیا اس کے ایک بہت بڑے حصّے کے وجود ہی کا تا ہنوز علم نہیں ہو سکا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے سائنسدان برملا اعلان کر چکے ہیں کہ جو کچھ علم و تحقیق کی گرفت میں آ چکا ہے یہ اس سے بہت کم ہے جو ابھی دریافت نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح سے شرعیات کی تمام تر تفصیلات کے اسرار و اغراض کا علمی احاطہ نہ صرف یہ کہ ابھی تک ناپید ہے بلکہ اس حیاتِ ناسوتی میں ممکن ہی نہیں ——— امام فخر الدین رازیؒ "مناظراتِ امام رازی" میں اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

لا تفی بمعرفتها عقول البشر بل الحق انه لا يعلمها الا الله سبحانه — انسانوں کی عقلیں ان حکمتوں کی تہہ تک رسائی نہیں کر سکتیں بلکہ حق یہ ہے کہ اللہ کے بغیر ان کو کوئی نہیں جانتا۔

تو جب کہ تکوین و تشریع کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات بھی اپنے اندر ڈھیروں مصالح رکھتی ہیں تو نظامِ تشریع کی وسعتوں کے مرکزی نقطے یعنی انسان کی خلقت و آفرینش کیونکر عبث و بے معنی ہو گی۔

زمین پر بسنے والی یہ حقیر سی انسانی مخلوق کائنات کے اندر وہی قدر و منزلت رکھتی ہے جو خود اس کے بدن میں قلب (دل) کو حاصل ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسد الجسد كله الا وهي القلب (مشکوٰۃ۔ باب الکسب وطلب الحلال) — بے شک بدن کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ درست ہے تو سارا بدن درست رہتا ہے اور اگر وہ خراب ہے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ سنو! وہ ٹکڑا دل ہے۔

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

توجس طرح سے دل نظام جسمانی کا وہ مرکز اور محور ہے جس کی صحت و سقم سے بدن کا کوئی حصّہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، بعینہٖ انسان بھی عالم کی اس وسیع اور پیچیدہ مشینری میں وہ اہم ترین کُل ہے جس کے احوال کا کائنات کے ذرّے ذرّے پر اثر پڑتا ہے۔ قرآنی ارشاد،

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ۔

خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں۔

(سورہ روم - آیت ۴۱)

میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ دل کی بابت تو یہ ہر بات ہر کسی کو معلوم ہے کہ وہ جسم کے اندر دورانِ خون کا ضامن اور کفیل ہے۔ بدن اور اس کے ایک ایک عضو کی زندگی اور حیات خون ہی سے [illegible] دل تندرست ہو تو ہر عضو کو اس کی مطلوبہ مقدارِ خون کی سپلائی کا کام بحسن و خوبی انجام دیتا ہے، جس کے نتیجے میں ہر عضو بھی جسم کے مجموعی نظام میں اپنی واجبی ذمہ داری سے ٹھیک ٹھیک عہدہ برآ ہوتا ہے اور اس طرح سے بدن کا کاروبار چلتا رہتا ہے۔ لیکن اگر دل میں کوئی نقص اور فتور رونما ہو جائے تو ظاہر ہے دورانِ خون میں خلل رونما ہوگا، نتیجۃً بدن کے مختلف حصے غذا سے محرومی یا کمی کی بدولت اپنے فرائض کی ادائیگی سے بالکلیہ یا جزدی طور پر دستبردار ہو جائیں گے جس کا اثر زندگی کے خاتمے یا اختلال کی صورت میں نمودار ہوگا۔ مگر کیا بدن پر اثر اندازی کا یہ عمل فقط دل کے ساتھ مختص ہے۔ اور اس اہمیت شان کی سزاوار ہے جو حدیث کے انتہائی مؤکدانہ اور مخصوصانہ اسلوب سے مترشح ہوتا ہے، ایسا کہنا اور باور کرنا تو نہ صرف ہمارے تجربات کے خلاف بلکہ خود صاحب حدیث کے ان ارشادات کے بھی منافی ہے جو بعض مواقع پر مسلمانوں کے باہمی تعلق کو بدن واحد کے اعضاء کے باہمی تعلق سے تشبیہہ دیتے ہوئے آپؐ نے وقتاً فوقتاً بیان فرمائے ہیں، مثلاً یہ کہ:-

المومنون کرجل واحد ان اشتکیٰ عینہٗ اشتکیٰ کلّہٗ و ان اشتکیٰ رأسہٗ اشتکیٰ کلّہٗ

(مشکوٰۃ المصابیح)

مسلمانوں کی مثال فرد واحد کی سی ہے۔ اگر اس کی آنکھ میں درد ہے تو پورے بدن میں درد ہوتا ہے اور اگر اس کے سر میں تکلیف ہے تو بھی پورا بدن تکلیف اٹھاتا ہے۔

ترى المؤمنين في تراحمهم و

تم مسلمانوں کو باہمی محبت اور ہمدردی میں

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

| | |
|---|---|
| تواد ھم وتعاطفھم کمثل | جسد واحد کیطرح پاؤ گے جس کا کوئی بھی |
| الجسد اذا اشتکیٰ عضوٌ تداعیٰ | عضو تکلیف زدہ ہو تو پورا بدن بے خوابی |
| لہٗ سائر الجسد بالسھر والحمّٰی | اور بخار سے دوچار ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ) |

تو کیا تاثیر و تاثر کے اس عموم کے بعد بھی جو بدن کے تمام اعضاء کو شامل ہے، اس معنی میں دل کے اختصاص اور این چنیں اہتمام کی کوئی گنجائش باقی ہے؛ علاوہ ازیں دل کی یہ کیفیت و حیثیت قدرت کی تخلیق سے متعلق ہے۔ تشریع سے اس کا کوئی تعلق نہیں جبکہ نبوّت کی ہر بات واضح طور پر شرعیات سے تعلق رکھتی ہے، خلقیات سے اس کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہوتی۔ ہاں ضمنی طور پر کوئی خلقی، طبی یا تاریخی حقیقت معلوم ہو جائے تو یہ الگ بات ہے لیکن یہ بھی تو ممکن نہیں کہ "ما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحیٌ یُّوحیٰ٥" ـــ اور "اوتیت جوامع الکلم" جیسے سندات و اعزازات کے ہوتے ہوئے صاحب شریعت کے اس کلام کو (العیاذ باللہ) کسی لفظی یا معنوی فروگذاشت پر حمل کیا جائے اور اس کی تصویب سے بے فکری برتی جائے۔

محظورات کی اس بھول بھلیاں سے نکلنے کے لئے اب صرف اور صرف ایک ہی راستہ باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ حدیثِ قلب کا وہ ظاہری مفہوم لیا ہی نہ جائے جس سے دل کی کسی بڑی خصوصیت اور کمال انفرادیت کا کوئی تصور نہیں بندھتا، نیز جو منصبِ نبوّت کے شایان بھی نہیں اور ایک ایسا مطلب بیان کیا جائے جو ایک طرف تو اس کے لفظی محاسن کا پورا پورا ساتھ دے اور دوسری طرف شریعت ہی کے کسی مہتم بالشان حقیقت پر روشنی بھی پڑے چنانچہ اللہ کا نام لے کر حسنِ آغاز و انجام کی دعاؤں کے ساتھ لائق فخر اسلاف کی راہنمائی اور پیروی میں اس مشکل کی عقدہ کشائی کا عمل شروع کئے دیتے ہیں۔ وباللہ التوفیق ـــــــ!!!

انسان کا بدن مادی عناصر اربعہ (مٹی، پانی، ہوا، آگ) کی آمیزش سے بن کر تیار ہوا ہے، ان عناصر اربعہ کے حکیمانہ اختلاط و امتزاج سے اس کے مضغۂ قلبیہ کے اندر ہی اندر ایک لطیف سا بخار اٹھ آتا ہے جو اس کے چپے چپے میں بھر کر جسم کے تمام اعضاء میں پھیل جاتا ہے۔ یہی بخار حس و حرکت کا خزینہ اور قصد و ارادہ کا گنجینہ ہوتا ہے۔ اور روح حیوانی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن جیسے کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس میں تو انسان کے ساتھ دوسرے تمام حیوانات بھی شریک ہیں جو حس و حرکت سے بہرہ مند اور قصد و ارادہ سے موصوف ہیں لہٰذا ہیئت و ترکیب کی اتنی سی بات تو انسان کو وہ شرف د

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

فضیلت ہرگز نہیں بخش سکتی جس کی بدولت وہ تمام ابناءِ جنس سے ممتاز ہے ـــــــ
حیوانوں کے اندر روحِ حیوانی کی نشأۃ سے زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اب بدن کے اقدام و امتناع کا ہر عمل اسی کیجانب منسوب کیا جانے لگتا ہے۔ لیکن انسان کے[1] اندر روحِ حیوانی کی پیدائش انسانی زندگی کی بنیاد تو رکھ دیتا ہے مگر خود زندگی فراہم نہیں کرتا۔ یہاں اس کے پیدا ہوتے ہی اس پر ایک اور "روحِ انسانی" کا فیضان ہو جاتا ہے جو اس کے ریشے ریشے میں سرایت کر کے معاً وہیں وہیں پہنچ جاتی ہے، جہاں جہاں روحِ حیوانی پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ روحِ حیوانی کا منبع یہی مضغہ قلبیہ ہے وہ یہیں پیدا ہوئی ہے اور یہیں پر ختم ہو گی لیکن روحِ انسانی کا منشاد مولد یہاں سے بہت دور عالم بالا کا کوئی مقامِ مستقر ہے اول فقط اس کی [illegible] ذرہ جلوہ گاہ اور قیام گاہ ہے۔

© rasailojaraid.com

---

[1] مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ اپنی تفسیر "معارف القرآن" میں سورہ حجر کی ۲۹ آیت "فاذا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سَاجِدِیْنَ۔ پھر جب ٹھیک کر دوں اس کو، اور پھونک دوں اس میں اپنی جان سے، تو گر پڑو اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے" ـــــــ کے تحت، روح اور نفس کے متعلق حضرت قاضی ثناء اللہ صاحبؒ کی تحقیق کا خلاصہ یوں ارقام فرماتے ہیں ـــــ

"حضرت قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ روح کی دو قسمیں ہیں، علویؔ اور سفلیؔ، روحِ علوی مادہ سے مجرد اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے جس کی حقیقت کا ادراک مشکل ہے۔ اہلِ کشف کو اس کا مقام عرش کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ وہ عرش سے زیادہ لطیف ہے اور روح علوی بنظرِ کشفی اوپر نیچے پانچ درجات میں محسوس کی جاتی ہے، وہ پانچ یہ ہیں، قلب، روح، سرّ، خفی، اخفی، اور یہ سب عالم امر کے لطائف میں سے ہیں، جس کی طرف قرآن کریم نے " قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ " میں اشارہ فرمایا ہے اور روح سفلی وہ بخار لطیف ہے جو بدنِ انسانی کے عناصر اربعہ سے پیدا ہوتا ہے، اور اسی کو نفس کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس روحِ سفلی کو، جسے نفس کہا جاتا ہے، ارواحِ علویہ مذکورہ کا آئینہ بنا دیا ہے، جس طرح جب آئینہ آفتاب کے مقابل کیا جائے تو آفتاب کے بہت بعید ہونیکے باوجود اس میں آفتاب کا عکس آجاتا ہے اور روشنی کیوجہ سے وہ بھی آفتاب کی طرح چمک اٹھتا ہے اور آفتاب کی حرارت بھی اس میں آجاتی ہے جو کپڑے کو جلا سکتی ہے۔ اسی طرح روحِ علوی اگرچہ تجرد کی وجہ سے بہت اعلیٰ وارفع و ابعد ہے [illegible] اس کا عکس اس روحِ سفلی کے آئینے میں آکر ارواحِ علویہ کے کیفیات و آثار

© rasailojaraid.com

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

روح انسانی پیدائش کے بعد انسان کے زمانہ قبل از بلوغ تک روح حیوانی سے اصل استعداد و صلاحیت کے علاوہ فعلی طور پر کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتی لیکن بلوغ کے بعد اس میں ادراک و تمیز کا وہ نیا چراغ روشن اور علم و ارادے کی وہ نئی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے اس کے اقتدار و اختیار میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں اب روح حیوانی ایک مرکب (سواری) اور روح انسانی ایک راکب (سوار) کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جو لگام کے فقط ایک اشارے سے اپنی سواری کو جہاں اور جیسی لے جانا چاہے' بلا حیل و حجت لے جا سکتی ہے' یہی نئی صورت حال انسانیت کی وہ خصوصیت اور تمغۂ امتیاز ہے جس کو محض حیوان کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔

جیسے کہ یہ بات معلوم ہو گئی کہ مضغۂ قلبیہ روح انسانی کا اولین مہبط و منزل ہے۔ چنانچہ بعلاقۂ حال و محل اس پر قلب (دل) کا اطلاق نہ صرف جائز بلکہ بہت کثرت سے ہوتا رہتا ہے۔ حدیث قلب میں قلب سے مراد یہی روح انسانی ہے جو سوار کی حیثیت سے سواری بدن کے ہر صحیح اور غلط چال کا ذمہ قرار پاتی ہے اور واقعۃً اپنی صلاح و اطاعت سے بدن کے تمام اعضاء کو صالح و مطیع اور اپنے عصیان و طغیان سے اسکو خدا تعالیٰ کا عاصی اور طاغی بنا دیتا ہے۔ حدیث کا یہ مفہوم واضح ہو جانے کے بعد اب اسکے لفظ و معنی کی مطابقت پر کھئے تو

---

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ

اس میں منتقل کر دیتا ہے اور یہی آثار جو نفوس میں پیدا ہو جاتے ہیں' ہر ہر فرد کے لئے ارواح جزئیہ کہلاتے ہیں۔

پھر یہ روح سفلی ان کیفیات و آثار کے ساتھ جن کو ارواح علویہ سے حاصل کیا جاتا ہے '

اس کا تعلق بدن انسانی میں سب سے پہلے مضغۂ قلبیہ سے ہوتا ہے اور اسی تعلق ہی کا نام حیات اور زندگی ہے۔ یہ روح سفلی پورے بدن میں پھیلی ہوئی باریک رگوں میں سرایت کرتی ہے جن کو شرائین کہا جاتا ہے اور اس طرح وہ تمام بدن انسانی کے ہر حصے میں پہنچ جاتی ہے۔ روح سفلی کے بدن انسانی میں سرایت ہی کو نفخ روح سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ کسی چیز میں پھونک بھرنے سے زیادہ مشابہ ہے اور آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے روح کو اپنی طرف منسوب کر کے "مِن رُّوحِی" اس لئے فرمایا ہے کہ تمام مخلوقات میں روح انسانی کا اشرف و اعلیٰ ہونا واضح ہو جائے کیونکہ وہ بغیر مادہ کے محض امر الٰہی سے پیدا ہوتی ہے نیز اس میں تجلیات رحمانیہ کے قبول کرنے کی ایسی استعداد ہے جو انسان کے علاوہ کسی دوسرے جاندار کی روح میں نہیں ہے ـــــــ

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com